محمد طاہر مسعود* ڈاکٹر عبدالواجد تبسّم**

جدید اُردو، سرائیکی اور پنجابی شاعری میں مزاحمتی عناصر: تقابلی جائزہ

Abstract: *Urdu, Saraiki and Punjabi have linguistic commonalities. The main reason for these is the geo-linguistic unity of these three languages. Urdu is spoken across the Sub-Continent. Punjabi and Saraiki are widely spoken in the Punjab. In other words we can say that these two are formative languages of Urdu.*

These languages also share a common literary heritage. At the same time they are open to the changing trends of world literature. Therefore, resistance, being integral feature of languages, is also one of the common factors in them. The poets showed protest against unjust ways of masters to subjugate the people. The equality of all human beings, independence, hunger, economical exploitation, social injustice, cruelty and politics remain the favorite topics of modern poets of these languages. This article is the study of this common literary trend.

زبان ابلاغ اور انسانی جذبات کی منتقلی کے براہ راست اظہار کا واحد ذریعہ ہے۔ کسی بھی زبان کا ادب ہی ایک ایسی مشعل ہے کہ جس کی روشنی میں انسانی زندگی کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی ہوتی ہے ۔ وطن عزیز میں متعدد زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں جو اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ ساتھ ایک مشترک تہذیبی، لسانی اور ادبی ورثے کی امین بھی ہیں۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش کے مطابق:

> "پاکستان کے مختلف علاقوں اور اس کے رہنے والوں میں نہ صرف تاریخی و تہذیبی اعتبار سے گہرا اشتراک موجود ہے بلکہ عقیدہ و فکر کی ہم آہنگی نے مشترک قدروں کو مزید نمایاں کیا ہے ۔ان کے ذخیرہ الفاظ میں گہرا اشتراک پایا جاتا ہے۔ ان زبانوں کے ادبیات نظم و نثر میں بھی گہری مماثلت موجود ہے۔"(۱)

*پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ پاکستانی زبانیں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

**اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، شعبہ پاکستانی زبانیں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اس اعتبار سے پاکستانی زبانوں بشمول اُردو، پنجابی اور سرائیکی کو دیکھا جائے تو ان میں لسانی اور ادبی سطح پر اشتراک پایا جاتا ہے۔ ان میں جدید نظم کے تناظر میں مزاحمتی رویہ قابل ذکر ہے جو اردو، پنجابی اور سرائیکی میں قابل توجہ ہے۔ مثلاً فیض کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر آئے دن یہ خداوند گان مہر و جمال
لہو میں غرق غمکدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

(نسخہ ہائے وفا ص ۲۶۹)

فیض نے چونکہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اس لیے انھوں نے اس تصور کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح استاد دامنؔ کے ہاں انسان کا دو طرفہ کرب کچھ یوں بیان ہوا ہے:

ایہناں آزادیاں ہتھوں برباد ہونا
ہوئے تسی وی او، ہوئے اسی وی آں
جاگن والیاں رَج کے لٹیا اے!
سوئے تسی او، سوئے اسی وی آں
لالی اکھیاں دی پئی دس دی اے
روئے تسی وی او، روئے اسی وی آں(۲)

استاد دامنؔ کا مطمع نظر انسانیت کے درد کو اجاگر کرنا ہے۔ وہ وسیع اور کشادہ تناظرات کے شاعر ہیں، لہٰذا وہ فیضؔ کے مانند ارض پاک میں آزردہ اور افسردہ لوگوں کے غموں کو بیان کرتے ہیں۔ اس حوالے سے فیضؔ ہوں، استاد دامنؔ ہوں یا پھر عاشق بزدار، مسئلہ اُردو، پنجابی یا پھر سرائیکی زبان کا نہیں بلکہ یہ انسان اور اُس کی زندگی سے جڑے مصائب کا ہے۔ عاشق بزدار کی شاعری میں مزاحمتی لہجہ کچھ یوں سامنے آتا ہے:

لالن!
میڈے من ماندے کوں
تیڈے آون دی چنتا ہئی
اپنی قیدن ماء دھرتی دی
پارت ہووی
ایندے ڈکھڑے سکھڑے سارے
آپ سنبھالیں (۳)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے خیال میں:

"عاشق بزدار جس دھرتی سے تعلق رکھتا ہے وہاں اسے اپنی شناخت ، اپنی پہچان اور اپنے تشخص کی طویل جنگ لڑنا پڑی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی زبان کا شاعر ہو محرومی اور جبر کے خلاف وہ توانا اور موثر انداز میں مزاحمت پر مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ان کے شعری اظہارات اپنے جغرا فیے، اپنی تاریخ اور اپنے معاشرتی ماحول کے تناظر میں مزاحمتی اور احتجاجی رویوں کا ایک واضح منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور جبر کی اس صورتحال کی نشان دہی کرتے ہیں ،جس سے خود انہیں ان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے لوگوں، تاریخی جبر میں سانس لینے والے انسانوں، استحصالی قوتوں کے خلاف لڑنے والوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے"(۴)

نصر اللہ ناصر کا نام سرائیکی زبان و ادب کے حوالے سے اہم ہے ۔انھوں نے ان رویوں کی عکاسی کچھ یوں کی ہے۔ کہتے ہیں:

تریہہ کوں چاتے اجڑ ٹرپئے
سکھ دے ٹوبھے گولن
ریت دی چادر تان کراہیں
ستے پئے ہن ٹوبھے
سکے پئے ہن ٹوبھے۔

(اجرک،ص ۴۴،۴۳)

منیر نیازی اردو اور پنجابی شاعری کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ان کے مزاحمتی رویے مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہیں:

کجھ اُنج وی راہواں اوکھیاں سن
کجھ گل و چ غماں دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوگ وی ظالم سن
کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی

(سفر دی رات ص۱۷)

سماجی خلفشاراور معاشرتی بدحالی کے زمانے میں ایک حساس سوچ رکھنے والا سخنور جب اس طرح کے کرب سے گزرتا ہے کہ غم زمانہ کے ساتھ، غم ہستی بھی لاحق ہو جائے تو پھر تمنائے مرگ ہی نجات کا ذریعہ دکھائی دیتی ہے۔

پاکستانی زبانوں میں ہر عہد کے محروم اور جبر ناروا رویوں کو اپنے اپنے مخصوص اسالیب میں اردو، پنجابی اور سرائیکی شاعری میں مختلف انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ساحرؔ لدھیانوی کی ایک نظم کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ ، یہ محل
یہ منقش درو دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق(۵)

مغلیہ عہد کا یہ شہکار جسے دنیا تاج محل کے نام سے جانتی ہے کو دیکھ کر شاعر کی حساسیت پر چوٹ پڑتی ہے کیونکہ وہ ایک مفلس اور نادار سماج کا باشندہ ہے ،اس لیے وہ ایسی بیش قیمت عمارت میں محبوب کو ملنے کا روادار ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ پروفیسر شریف کنجاہی پنجابی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"پنجابی ادب زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ پنجابی شاعری و فن کا زمین سے گہرا رشتہ ہے، اس لیے اس کے ہاں زندگی اپنی تمام تازگی و توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ دُرست ہے کہ اس کا محرک زندگی کا براہ راست مشاہدہ اور مطالعہ ہے اور اکثر نجی یا سماجی تقاضے ہی اس کا موضوع ہوتے ہیں اور شاعر اپنے آپ میں اور معاشرے میں ایک قسم کی ہم آہنگی محسوس کرتا ہے"(۶)

پنجابی زبان ہی کیا ہر زبان اور ہر خطے کا شاعر نجی یا سماجی تقاضوں کو اپنے جذبات اور اسلوب کی ہم آہنگی کے ساتھ اپنی مخصوص لفظیات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ عارف عبدالمتین نے بھی انسانی محرومیوں کو اپنی نظموں میں اجاگر کیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو:

میرے چار چو فیرے چوکھاوڈا سارا تھل
جس وچ ہر پل اڈدی رہندی سڑی بلدی ریت
تھل دی ذات دا اک اک ذرا جاناں ہاں میں
اوہ دن دور نہیں اے جس دن
میرے خون دے پیاسے ذرے مینوں مار مکاون گے
میری اک اک نرم تے کومل پنی نوں
دھکندی فیرے پاون گے(۷)

اس نظم کی بنیادی بنت اور موضوع کی اُٹھان واضح کرتی ہے کہ عارف عبدالمتین نے پنجاب کے تھل کے تناظر میں دکھ اور آزردگی کے گہرے استعارے سامنے لاکر انسانی محرومیوں کو ریت کے جلتے ذرات سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں تک سرائیکی نظم کا تعلق ہے تو اس نے بھی بدلتے عہد کے سماجی تناظر میں خود کو سمویا ہے۔ اس حوالے سے "اشولال" نے صدیوں سے ہوتے ہوئے استحصال کو اپنی نظموں میں بہ حسن و خوبی بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری میں جذبے کی حدت بھی ہے، لفظیات کی رنگارنگی بھی ہے اور بیان کا فلسفیانہ رنگ بھی۔ ان کی شاعری کا مرکز و محور نہ صرف سندھ ساگر کی تہذیب اور سرائیکی خطے کی ثقافت ہے بلکہ وہ انسان کے دکھوں اور محرومیوں کو بھی پیش کرتے ہیں ایک نظم کی چند سطریں دیکھیے:

ادھی راتیں چن پکڑیجے
جنگل وین کرے
تارہ تارہ چگدی چپ کن
وَستی روز ڈرے
پرے کتھائیں مرلی اتے
دُکھ دی راندائے
بہوں پرانی تانگھ اساڈی
رستہ انت کرے
چن دی جان چھٹے

(چھیڑو ہتھ نہ مرلی ص۳۶)

اس نظم میں اشو لال نے اپنے اردگرد کی علامات سے زندگی کے مختلف مسائل اور مصائب کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے "مرلی" جو موسیقیت سے بھرپور ساز ہے، پر دکھ کی لے کا ابھرنا دراصل تہذیب اور سماج میں ابھرتے گہرے غم کی نشاندہی ہے۔ ان کی ایک اور نظم "غلام" کے چند اشعار دیکھیے:

ساڈے نال نہ پیراساڈے
نہ ہتھ وس وسنیک
اینویں کیری تھی کے مکسی
تالو تل ءچ رات
دھمی دھمسی یا نہ دھمسی

(چھیڑو ہتھ نہ مرلی ص ۱۱۴)

انسان جس سماج میں سانس لیتا ہے اور معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے اس سے اس کی جذباتی وابستگی ہو جاتی ہے اور پھر حساس شاعر تو اور بھی شدت اور جذباتیت سے مغلوب ہو کر ان سب کو محسوس کرتا اور اپنے کلام میں پیش کرتا ہے اس حوالے ڈاکٹر ناصر عباس نیّر لکھتے ہیں:

"کسی بھی عہد کی عمومی فضا تہ در تہ ہوتی ہے۔ ابتداء میں کسی تخلیق کار کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ان سب تہوں سے آگاہ ہو سکے۔1930ء کی دہائی میں ایک طرف قومی آزادی کی تحریکیں جاری تھیں تو دوسری طرف اردو ادب میں انقلاب کی داعی، ترقی پسند تحریک کا غلغلہ بلند تھا"(۸)

فیضؔ جب کہتے ہیں:

تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے تو دراصل وہ اپنے عہد کی ایک پہلی سرسری تہ کو سامنے لاتے ہیں کہ معیشت کے گورکھ دھندے نے انسانوں کو غم محبوب سے دور لا کھڑا کیا ہے۔اسی فکر کے متوازی جہاں حبیب جالبؔ، ساحرؔ لدھیانوی جیسے شعراء نے اپنے اسلوبِ شاعری کو ترقی پسندیدیت اور انسانی دکھوں کے مصائب سے مزین کیا وہیں پر احمد فرازؔ نے بھی اپنی انفرادی اور توانا آواز کے ساتھ انسان دوستی کی حمایت اور جبر نارو اکے سلسلوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ان کی ایک نظم ملاحظہ ہو:

یہ تسلط یہ ماہ و چشم یہ زمین
بس تمہارے لیے ہے تمہارے لیے
دورِ فردا کے فرمانروا ہو تمہیں
تم کو ہونا ہے اجداد کا جانشین
پاگلو! ہم سے عانی نظر دیدہ ور
تم سے جو بھی کہیں مان لو
اپنے اپنے مراتب کو پہچان لو

(تنہا تنہا ص ۱۵۴)

احمد فرازؔ کے ہاں ایک ایسی مزاحمت اور بغاوت ملتی ہے جس سے نئے عہد کے انسانوں کو نہ صرف حوصلہ و تسلی میسر آتی ہے بلکہ ان کو آگے بڑھنے اور مسلسل تگ و دو کرنے کی بھی تحریک ملتی ہے۔پنجابی زبان میں اسی قسم کا

اسلوب اور رنگِ سخن طارقِ عزیز کے ہاں مل جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

مڈھ قدیم توں دنیا اندر
دو قبیلے آئے نیں
اک جنہاں نیں زیر نیں پیتے
اک او جنہاں پلائے نیں(۹)

اس سے یہ واضح ہے کہ ازل سے انسان حق اور باطل کی ایک لامتناہی جنگ میں شریک ہے اور ایک طرف سقراط جیسے انقلاب پسند لوگ ہیں تو دوسری جانب آمریت کے گماشتے اپنی من مانیوں اور جبر واستبداد کے سلسلوں کو آگے بڑھانے میں محو و منہمک ہیں۔ شوکت ہاشمی سرائیکی خطے کی الگ پہچان ہیں۔ان کا معتبر حوالہ تو نعت گوئی ہے مگر ایک سرائیکی نظم کا عجیب والہانہ و انفرادی انداز دیکھئے:

ظلم دی بائبل دے متھڑے اتے
اپنے مضبوط دستخط کرتیں
پنج لفظاں دی سطر لکھ چھوڑی
ظلم توں انحراف لکھدا ہاں
میکوں توفیق ڈے خداوندا
ظلم دی بائبل کوں پاڑ گھتاں
ورقہ ورقہ کراں تے ساڑ گھتاں(۱۰)

انسان بہ نام رنگ و مذہب اور بہ نام خدا وکتاب ایک دوسرے سے نبرد آزما چلے آتے ہیں انھیں کب توفیق اتحادِ انسانی ہوگی اوروہ کب انسان کو آدمؑ کی اولاد تصور کرتے ہوئے ایک وحدت انسانی کے سلسلے سے منسلک کر سکیں گے، اسی انداز فکر کو ہم ہر دور کے اردو، پنجابی اور سرائیکی شاعری میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں اور اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ عہد کی شکستگی اور ماحول کا جبر کسی بھی صورت کوئی بھی حساس فرد برداشت نہیں کر سکتا۔

معاشرتی خلفشار، سماج کے ارتقائی رویوں، افراد معاشرہ کے بدلتے نظریات اور میدان حیات میں تغیرات کی بدولت ادب بھی اپنے موضوعات، طرز بیان، اسالیب، انداز اظہار اوراصناف کے لحاظ سے تغیر آشناہوتا رہتا

ہے۔ادیب اور شاعر جس طرح روایت سے بغاوت کرتے ہیں اسی طرح وہ لاشعوری طور پر اس روایت سے کسی نہ کسی طرح اپنا رابطہ بحال بھی رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہر عہد کا شاعر و ادیب اپنے طور پر محبت، امن اور معاشرتی آسودگی کی خواہش کا اظہار اور انسان کے غیر انسانی رویوں پر احتجاج کر رہا ہے ۔ ڈاکٹر خیال امروہوی مزاحمتی ادب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"مزاحمت کا مفہوم تو یہی ہے کہ سماجی برائی کو روکنے کے لیے فکر اور جرأت کو کام میں لاتے ہوئے ادبی نقطہ نظر سے محاذ قائم کرنا اور مزاحمتی رویے سے اپنی کمٹمنٹ پر قائم رہنا، مزاحمت ہمیشہ شر کو روکنے ، خیر کو تحلیل کرنے اور اسے سماج میں رائج کرنے کے لیے کی جاتی ہے اگر غیر سیاسی ادب میں بھی ایسا مزاحمتی رویہ یا حکمت عملی موجود ہو تو وہ بھی مزاحمتی ادب کہلائے گا"۱۱

خیال امروہوی مزاحمتی ادب کے سرخیل رہے ہیں۔ اشعار دیکھئے:

نظام جبر و قارانا خرید نہ لے
جنوں کی شہ پہ جمال صدا خرید نہ لے
مجبور کو دیتا ہے کہاں حق کوئی غاصب
حق چھیننا پڑتا ہے لٹیرے سے جھپٹ کر
میری محنت سے جہاں گندمی کھلیان لگے
میں نے اس کھیت میں فاقوں کا تماشہ دیکھا
آج جس رنگ سے چاہو ہمیں مصلوب کرو
کل یقیناً یہی انداز ہمارا ہوگا
انساں سے محبت کی سزا اتنی کڑی تھی
نفرت کے تمانچے مرے رخسار تک آئے

(تلخاب ص ۲۶)

خیال امروہوی کا یہ اسلوب ان کے فکری تنوع اوراس عہد کا پتا دیتا ہے جب کہیں جبر کے رویے انسانوں اور قوموں کو پابند کر رہے تھے اور کہیں معاشی استحصالی قوتیں سسکتے اور بلکتے انسانوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم کر رہی تھیں، ایسے میں خیال امروہوی کے ہی خطے لیہ کے اشو لال فقیر کی آواز ابھرتی ہے۔

نچیں گاون مینہ تے ساون
چھیڑ وساکھ اجایا
منصب دار منادی کیتی
حاکم، حکم سنایا
پھل درگاہوں چن سگدے او
ہار بنانئیں سگدے
شاہ حسین کوں پڑھ سگدے او
میلے گا نئیں سگدے

(چھیڑو ہتھ نہ مرلی ص37)

ایک اور نظم ملاحظہ ہو:

مونجھاں ڈاج وچھایا
درد صلیبیں کھارے چڑھیا
چڑھ سولی مسکایا
رات کچاوے اندر پاکے
لوکاں سمجھ پرنایا
سمجھ واپس نہ آیا

(چھیڑو ہتھ نہ مرلی ص39)

اشو لال نے ان حکمرانوں کی سفاکیوں اور شاطرانہ پالیسیوں سے نقاب اٹھایاہے جو خلقت خدا کو محض اپنی حکومت اور ریاست چلانے کے لیے قربانی کی بھینٹ چڑھادیتے ہیں ۔ اس تناظر میں عزیز شاہد کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

اساں سندھ دی من دے وسدے دھرتی واس پرانے
ساڈے تھل دمان تے ریجاں پیٹ بولی لئی لانے
جھوکاں بھانے وستیاں ٹھٹھیاں گڑھیاں گوٹھ اساڈے

اندھے خواب اکھیں پئے لہندن ہن تاں اکھیں کھولو
اج دے پل دی پیڈنکھ رسائو کل بے شک موجاں مانو
دھر دے گونگے دھرتی واسو
پل دے پیر سنجانو

(عزیز شاہد، من دریا تے ڈیرہ غازیخان ص۹۱)

خرم بہاولپوری کہتے ہیں:

جن کن بھڑڑا جال کھنڈا ایو
جتھ کتھ چنگ چنگاری لایو
کیا دلی، کشمیر وو
تیڈے جوبن دی ہر جا تھر تھل
ساڑم تتڑی وا جاں ہلدی
پیریں چھالے ریت پہ چلدی
خرم مونجھاں مار مکایا
زوریں نال تے ڈھاپلوایا
تتڑی کوں تقدیر وہ
نک توں چھلکے سول مٹھل

(خیابان خرم، ص۵۷۱)

یہ ایک حیرت انگیز تجربہ ہے کہ روہی چولستان میں بیٹھا ایک تخلیق کار دلی اور کشمیر کے حوالے دے کر اپنے محبوب حقیقی سے محو گفتگو ہے اور ساتھ ہی وہ روہی، تھر اور تھل کے دکھ زدہ لوگوں کی کتھا بھی بیان کرتا ہے کہ کس طرح ان لوگوں کے پیر چھالوں سے اٹ گئے ہیں اور ان کے نصیب میں ابھی تک زندگی اور اس کی آسائشوں و مسرتوں سے دوری لکھی ہوئی ہے اور یہ اس تک کبھی رسائی بھی حاصل نہیں کر سکتے تو اس موقع پر فیضؔ احمد فیض یاد دلاتے ہیں:

تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
جھانجھراں وانگ زنجیراں چھنکائیاں نیں
کدی کنیں منداں پائیاں نیں
کدی پیری بیڑیاں پائیاں نیں

(نسخہ ہائے وفا ص ۲۶۹)

فیضؔ ایک ایسے جہاں میں لے جاتے ہیں کہ جہاں عاشق محبوب کی آنکھوں اور اس کے حسن و جمال سے ماورا زمانے کی تلخیوں اور معاشرے کی اقدار کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے اور زمانے کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اس انداز فکر سے یہ واضح ہے کہ انسان جو ازل سے خدا کی اس دھرتی پر خدا کے نظام کو سمجھنے کی کاوش میں لگا ہے، اسے اس کی تقسیم پر اکثر و بیشتر حیرت اور استعجاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے اس پر بسا اوقات تشکیک کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں کہ اس کا خدا کسی کو بیش بہا خزانے عطا کر دیتا ہے اور کسی کو دربدر بھیک کے لیے مجبور کرتا ہے سو اسی طرح کے افکار اور رویوں کو ان ہر تین زبانوں کے شعراء کے ہاں موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔

شاعر معاشرے میں پائی جانے والی ناانصافیوں، ناہمواریوں اور بدعنوانیوں کو اپنی شاعری کا موضوع کچھ اس انداز سے بناتا ہے کہ شعور ذات کا سماج کے ساتھ تعلق جڑ جاتا ہے۔ سرائیکی شاعری میں اقبالؔ سوکڑی اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ ان کی ایک نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو:

ساڈے پیر نہ پہلے بھوئیں تیں ہن
ساڈے سر توں کہیں اسمان چھکیے
ساڈے لفظ یتیمیں وانگ رلیے
ساڈی نظم دا کہیں عنوان چھکیے
چھک تان اچ اجرک لیراں تھئی
ساڈے گئے اقبال ارمان چھکیے
ہک ساہ ہا آئے ہیں در تیڈے
او وی دڑکے ڈے دربان چھکیے

(اٹھواں اسمان ص ۱۰۵)

اقبال سوکڑی کی شاعری میں عصری شعور کے ساتھ ساتھ الفاظ کا انتخاب اور پیش کش بھی انہیں اس حوالے سے انفرادیت کا تاج پہناتی ہے کہ وہ پہاڑوں اور تھل دامان کے باسیوں کا کرب ان میں رہ کر خود بھی محسوس کر چکے ہیں ،کچھ اسی طرح کے تصورات ہمیں یوسف حسن کی پنجابی نظموں میں مل جاتے ہیں:

تھلویں مٹی اُپر ہووے
ساوا سارا کھتیر ہووے
تیرے میر دی خار نہ ہووے
کوئی کسے تے بھار نہ ہووے
جیون دا ہر جو ہر کھلے
سانجھ بہار دا چانن پھلے(۱۲)

یوسف حسن دعا اور امید کے ساتھ اس منظر نامے کو بدلنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں ،جہاں قائد اعظم نے ایک خواب کی تعبیر کے ذریعے نیا جہان تشکیل کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب وہاں چاروں طرف افسردگی اور آہ و فغاں ہے۔

پاک دھرتی کے وجود میں آنے کے بعد یہ تسلی اور تشفی تو ضرور ہو گئی کہ ہم جہان تازہ کی بنیاد رکھ چکے ہیں مگر جب حساس اور جاگتے شعور رکھنے والے دانش مند وں کو احساس ہوا کہ یہاں بھی وہی دستور رائج ہے کہ جو پہلے بھی تھا بلکہ بقول ناصر کاظمی کے یہ حالت ہو چکی ہے:

راہ زنوں سے تو بچ کے نکلا تھا
اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

ایسی صورتحال میں لازم تھا کہ پنجابی اور سرائیکی شاعری پر بھی اثرات مرتب ہونے تھے۔ چنانچہ راشد حسن رانا کہتے ہیں:

انہاں دے جبر توں تنگ آ کے
مینوں سوچنا پئے ریا ہے
کہ اے دھرتی ایہدی مٹی
ایہدے موسم ایہدے دریا
ایہد یاں چھاواں ، رستے

تے رسماں ریتاں ، لوک کہانیاں
مینوں زیادہ پیارے نئیں
یا عقیدے؟

(پاکستانی پنجابی شاعری، ص 327)

اب ایک ایسا انسان جو دھرتی ماں سے والہانہ محبت رکھتا ہے اور اسے اپنی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو مذاہب اور عقیدوں سے بھی زیادہ مسحور کرتی ہے تو یہ رویہ دھرتی کے لوگوں میں بھی پیدا کرنا اُسے لازمی فرض محسوس ہوتا ہے۔ پنجابی شاعری کے ساتھ ساتھ سرائیکی نظم و غزل میں بھی شعوری طور پر ایسی کاوشیں مل جاتی ہیں۔ قیس فریدی کہتے ہیں:

میکوں نہ روکو
میکوں ونجن ڈیو
جو میڈی منزل بہوں پرے ہے
خدا دے ناں تے غلام لوکو
میکوں نہ روکو
میں آون آلئیں گریب تے
بے گناہ نسلیں دے واسطے
تہاڈی طرفوں قرار تے
اعتبار نیساں
میکو نہ روکو
میکوں ونجن ڈیو

(پرکھرا ص ۱۳)

اس طرح ایک استفہامیہ پیرائے میں سرائیکی سخن ور دھرتی کے ذہنی غلام لوگوں کو للکارتا ہے اور نئی صبح کے سورج سے گزشتہ دنوں کی کوکھ میں رونما ہونے والے مظالم کا حساب مانگتا ہے۔ غرض اردو، پنجابی اور سرائیکی شاعری میں یہ مماثلت پہلو بہ پہلو چلتی رہتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی زبانیں و ادب، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 1996، ص69
۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، پَیلھوں نمبر7، ملتان، پَیلھوں پبلی کیشنز، 2014، ص 255
۳۔ ایضاً، ص 315
۴۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، سرائیکی وچ مزاحمتی شاعری، ملتان، سرائیکی ادبی بورڈ، 2017، ص 19، 18
۵۔ خالد شریف، اردو کی شاہکار نظمیں، لاہور، ماورا، 2010، ص 71
۶۔ شریف کنجاہی، پاکستانی پنجابی شاعری، لاہور، محکمہ اطلاعات، ثقافت و امور نوجوانان، حکومت پنجاب، 1999، ص 171
۷۔ شریف کنجاہی، پاکستانی پنجابی شاعری، ص 171
۸۔ ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر، پَیلھوں نمبر7، مضمون مشمولا، مجید امجد کی نظم نگاری و شعریات کے اہم پہلو، ملتان، پَیلھوں پبلی کیشنز، 2014، ص 25
۹۔ پاکستانی پنجابی شاعری ص 248
۱۰۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، سرائیکی وچ مزاحمتی شاعری ص 117
۱۱۔ خیال امروہوی، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب اور ہمارا دانشور، سپوتنک، لاہور، 1998، ص 107
۱۲۔ پاکستانی پنجابی شاعری ص 345
۱۳۔ قیس فریدی، پرکھرا، بہاولپور، سرائیکی ادبی مجلس، 1995، ص 19

☆☆☆☆☆